Model Questions with Answer

FYUG, Semester-I

Paper: IRC-I(Urdu)

Time: 03 Hours Full Marks:75

Group-A

ا. درج ذیل معروضی سوالات کے صحیح جواب دیجئے: 1x5 = 05

(i) لفظ اردو کس زبان سے تعلق رکھتا ہے ؟

(A) عربی (B) فارسی (C) ہندی (D) ترکی

جواب۔ (D) ترکی

(ii) کس بولی سے اردو زبان کا خاص تعلق ہے ؟

(A) برج (B) کھڑی (C) بھوجپوری (D) پنجابی

جواب۔ (B) کھڑی

(iii) قصیدہ کے لئے ضروری ہے ؟

(A) حقیقت پسندی (B) ضلع جگت (C) نرم اور پُرسوز آواز (D) بلند تخیل اور شوکت الفاظ

جواب۔ (D) بلند تخیل اور شوکت الفاظ

(iv) مکالمہ کس صنف کے لئے لازمی جزو ہے ؟

(A) ناول (B) افسانہ (C) ڈراما (D) داستان

جواب۔ (C) ڈراما

(v) کس تحریک کے دوران اردو میں صنف ناول کا آغاز ہوا؟

(A) رومانی تحریک (B) علی گڑھ تحریک (C) حلقہ ارباب ذوق (D) ترقی پسند تحریک

جواب۔ (B) علی گڑھ تحریک

۲. درج ذیل میں سے تین سوالوں کے جواب اختصار اور جامعیت کے ساتھ دیجئے: 3x10 = 30

(i) اردو زبان کے آغاز وارتقاء پر مختصر نوٹ لکھئے؟

جواب: تو بلبل گلستا ں چہکی کبھی د کن میں
پھولی پھلی پھر آ کر دلّی کے خوش چمن میں

اردو، ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''لشکر'' کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس فوج اور لشکر میں مختلف رنگ و نسل کے افراد شامل ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح اردو بھی مختلف زبانوں کے الفاظ کا مرکب ہے جو اپنے ابتدائی دور میں صرف فوج کی چھاؤنیوں تک محدود تھی مگر اس کی مٹھاس نے ایسا جادو جگایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ پورے ہندوستان کی محبوب زبان بن گئی۔

''اردو'' ایک ہند آریائی زبان ہے جس کا ارتقاء ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہندوستان میں اردو کی ابتدا محمود غزنوی کے آنے کے بعد یعنی آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل ہو چکی تھی۔ لیکن اس زبان کا مکمل ارتقاء مغل بادشاہ شاہ جہاں کے زمانے میں ہوا، جہاں اسے اردوئے معلّٰی کا نام ملا۔ اس کے علاوہ مختلف ادوار میں اردو زبان کو ہندی، ہندوی اور ریختہ کے نام سے بھی شہرت حاصل ہوئی۔

''اردو'' برج بھاشا سے نکلی ہے جو دہلی اور متھرا کے قرب وجوار میں بولی جاتی تھی۔ برج بھاشا کے علاوہ اردو کے خمیر میں عربی، فارسی، پنجابی، کھڑی بولی، ترکی اور پرتگالی زبان کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ ۱۰۰۰ء میں جن مسلمانوں کی آمد شمال کے راستے ہندوستان میں ہوئی انہوں نے دہلی کو اپنا مرکز بنایا۔ ضرورت کے مطابق انہوں نے اپنی زبانوں (عربی، فارسی اور ترکی) میں برج بھاشا کے الفاظ شامل کئے، اس کے علاوہ مغل بادشاہ شاہ جہاں نے جب آگرہ سے دہلی اپنا دارالسلطنت منتقل کیا اور شہر و قلعہ میں مختلف زبانوں کے بولنے والے افراد ایک ساتھ جمع ہوئے تو ایک نئی زبان نے جنم لیا، اسی زبان کو اردو کہا جاتا ہے۔

اردو زبان کی نشو ونما میں ہندوستان کے تمام علاقوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اس بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا نظریہ کافی وسیع ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''اردو زبان کی ابتدا کسی ایک علاقے یا اس کے رہنے سہنے والوں سے نہیں بلکہ مختلف قوموں کے اثرات اور تہذیب وتمدن سے ہوئی''۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ آپسی بھائی چارے اور میل محبت کی نشانی

ہے۔ یہ کسی ایک مخصوص علاقے ،قوم ونسل کی زبان نہیں، بلکہ پورے ملک کی ہر دل عزیز زبان ہے جس کی نشو ونما میں فوجیوں، تاجروں، حاکموں اور صوفی بزرگوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ بقول داغ دہلوی:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(ii) بولی اور زبان میں کیا فرق ہے؟ واضح کیجئے۔

جواب: انسان کو گویائی کی قوت فطری طور پر حاصل ہوئی ہے، جس طرح کانوں کو سننے کی صلاحیت دی گئی، آنکھ کو دیکھنے کی قوت بخشی گئی، دماغ کو سوچنے اور سمجھنے کی بصیرت سے ہمکنار کیا گیا اور دل کو دھڑکنے کی قوت دی گئی۔ ٹھیک اسی طرح انسانی نطق کو بولنے اور بات کرنے کی صلاحیت سے آشنا کیا گیا۔ اسی لئے لفظ و بیان کے سلسلے میں بعض شخصیتوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ یہ ایک عطیہ فطرت ہے۔ قدرت نے انسان کو لفظوں کے استعمال کی ایک ایسی صلاحیت بخشی ہے کہ جس کے وسیلے سے انسان اپنے احساسات و جذبات اور خیالات وتصورات کو نہ صرف یہ کہ دوسروں تک پہنچاتا ہے بلکہ انہیں ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی کر لیتا ہے۔ اسی لئے زبان کو ایک متحیّر لسانی صداقت بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

ماہرین بشریات نے انسانی معاشرے کی جو تاریخ دریافت اور قلم بند کی ہے وہ پانچ ہزار سال کے اندر کی تاریخ ہے۔ لیکن انسانی معاشرہ اس سے قبل بھی آباد و فعال رہا ہوگا۔ دور وحشیت یا انسانی معاشرے کے اس تاریک دور میں بھی خیال و احساس کی ترسیل کی ضرورت محسوس کی گئی ہوگی کیونکہ انسان دور ولادت کے مرحلے ہی سے فکر وفہم رکھنے والا ''حیوان ناطق'' تھا۔ جیسے جیسے اس کی شخصی اور معاشرتی ضرورتیں بڑھتی گئی ہوں گی، اس نے الفاظ کے اختیار واستعمال کی شعوری اور غیر شعوری طور پر جدوجہد بھی کی ہوگی۔ بقول ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور:

''زبان اور انسانی سوچ بچار کا تعلق چولی دامن کا سا ہے۔ سوچنا دراصل اپنے ذہن میں گفتگو کرنا ہے اور زبان اس اندرونی گفتگو کی ترجمانی کرتی ہے، اس کو شکل پہناتی ہے، خاص خاص ذہنی اشاروں کے ذریعہ سے معین کرتی ہے اور ساتھ ہی اس کو آسان بھی بناتی ہے''۔ (''ہندوستانی لسانیات''، ص:۲۸)

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں زبان کی قوت اور اس کی اہمیت بہ آسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس کی نشو ونما ایک طویل مدت میں تدریجی طور پر ہوتی ہے۔ الفاظ آہستہ آہستہ پھیلتے اور بڑھتے ہیں اور پھر یہ سب مل کر زبان کے معیاری سانچے کی تشکیل مکمل کرتے ہیں۔ ہر زبان اپنے ارتقاء کے ابتدائی دنوں میں خام نوعیت

میں ہوتی ہے جسے بولی کہا جاتا ہے۔ گویا زبان کی ابتدائی یا غیر ترقی یافتہ شکل بولی ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ایک بولی اپنے ابتدائی مدارج کو طے کرتی جاتی ہے اس کے لفظی ذخیرے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور الفاظ کی باہم آویزشوں کا شعور ترقی کے مرحلوں سے گزرتا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ اس کے اندر شعر و ادب کی تخلیق کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور تب یہ بولی زبان ہو جاتی ہے۔ یعنی عوامی معاشرے کی عام ضرورتوں سے بلند ہو کر ادبی اور تہذیبی شعور کی مصوّری کی جانے لگے تب ایک بولی زبان کے زمرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ بولی کسی زبان کا اوّلین خام سانچہ ہوتی ہے جس کے اندر بول چال کی صلاحیت تو ہوتی ہے، شعر و ادب کی تخلیق کی قوت نہیں ہوتی۔

(iii) داستان کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے اجزائے ترکیبی اور اہمیت پر روشنی ڈالئے؟

جواب: کہانی انسانی سماج اور انسانی شعور کے ارتقاء کی تاریخ ہے۔ جیسے جیسے انسان کی سماجی زندگی ترقی کرتی گئی اور اس کے علم و شعور کی حدیں بڑھتی گئیں ویسے ویسے کہانی کا مواد اور اس کے موضوعات بھی بدلتے گئے اور وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتی ہوئی حکایت، داستان، ناول اور افسانے کی منزل تک پہنچ گئی۔ انسان جب پچھلے واقعات یا اپنی زندگی کے تجربات دوسروں کے سامنے دلچسپ اور موثر طریقے سے بیان کرتا ہے کہ سننے والوں پر بھی وہی اثر ہو۔ واقعات کو دلچسپ اور پُر اثر طریقے سے بیان کرنا ہی کہانی کے فن کا جوہر ہے۔

داستان ایک رومانی کہانی ہے جس میں خیالی واقعات میں حسن و عشق کی رنگینیاں اور لطیف بیان ہوا اور اس کا مقصد سننے والوں کی دلچسپی اور دل بہلانے کا سامان پیدا کرنا ہو۔ بقول وقار عظیم:

''داستان ایسی رومانی کہانی کو کہتے ہیں جس میں خیالی واقعات کا بیان، مافوق الفطرت عناصر کی تحیّر خیزی، حسن و عشق کی رنگینی، واقعات و حادثات کی بہتات و پیچیدگی اور بیان کی لطافت ہو۔ اس کا مقصد اپنے قاری کو فرحت و مسرت کا سامان فراہم کرنا ہوتا ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ داستان کے لفظی معنی قصے اور کہانی کے ہوتے ہیں۔ مگر ادب کی زبان میں داستان اس قصے اور کہانی کو کہا جاتا ہے جس میں مذہبی، سماجی اور اخلاقی قصّہ نصیحت آمیز انداز میں بیان کیا گیا ہو۔

ہمارے ملک میں قصّہ کہانیوں کا ہمیشہ سے رواج ہے۔ داستانیں ایسے وقت میں ترقی پذیر ہوئی ہیں جب کبھی ملک میں سیاسی یا تہذیبی زوال آتا ہے اور انسان اپنی زندگی کی ناکامیوں کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے اور ان پریشانیوں اور ناکامیوں سے تنگ آ کر دل کو سکون پہنچانے کے لئے تاکہ تھوڑی دیر کے لئے دلی تسکین ہو سکے، ایسے گوشے تلاش کرتا ہے۔ وہ یہی قصّے کہانی ہیں جن سے انسان اپنا دل بہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

شاہی درباروں اورعوام میں داستانوں کا کافی رواج رہا ہے۔

اجزائے ترکیبی: اردوداستان کو ماہرین ادب نے مندرجہ ذیل اجزاء میں تقسیم کیا ہے:

(i)قصّہ (ii) پلاٹ (iii) کردارنگاری (iv) مرقع نگاری (v) منظرنگاری (vi) جذبات نگاری (vii) خاتمہ

مندرجہ بالا اجزاء ایک کامیاب داستان کے لئے لازمی ہیں۔ درس اخلاق تمام تر داستانوں کی نمایاں خوبی ہے۔ ہر داستان میں حق کی فتح اور باطل کی شکست ہوتی ہے۔ عام طور پر داستان کا انجام اچھائی اور سچائی کی فتح ہوتی ہے جو قاری کے لئے بھی نصیحت آمیز ہوتا ہے۔ اردو ادب میں داستانوں کے وجود پر کلیم الدین احمد یوں رقم طراز ہیں:

''داستان گوئی انسان کا قدیم مشغلہ رہا ہے اور کسی نہ کسی صورت میں تقریباً ہر ملک اور قوم میں پایا جاتا ہے۔ اردو میں بھی اس مشغلے کا وجود لازمی تھا اور دوسری ادبی صنفوں کی طرح یہ بھی ایران سے اخذ کیا گیا ہے''۔

اردو داستانوں میں دو طرح کے اسلوب نظر آتے ہیں:

(۱) سادہ سلیس: ''باغ و بہار'' اس اسلوب کی نمائندہ ہے۔

(۲) رنگین: ''فسانۂ عجائب'' اس اسلوب کی نمائندہ ہے۔

اہمیت: حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی اسلوب ہمارے نثری سرمائے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور قدیم داستانیں ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان ہی کی بدولت اردو نثر کو پایۂ اعتبار نصیب ہوا۔ داستان نے اردو کو ملاّ وجہی، میر امّن، انشاء اور سرور جیسے صاحب طرز انشاء پرداز عطا کئے۔ طوالت نے حالانکہ داستان کو نقصان پہنچایا مگر یہی داستان اردو میں ناول کی پیش رو ثابت ہوئی۔

(iv) ڈراما کی تعریف کیجئے اور اس کی تکنیک پر روشنی ڈالئے۔

جواب: ڈراما یونانی زبان کے لفظ ''ڈراؤ'' سے مشتق ہے، جس کے لفظی معنی عمل یا ایکشن کے ہوتے ہیں۔ ڈرامہ اردو شعر و ادب کی سب سے قدیم اور بڑی اہم صنف ہے۔ لیکن ادب اور ڈرما میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ادب لفظوں کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا لیکن ڈراما ایسا بھی ہوسکتا ہے جس میں ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا گیا ہو۔ بلکہ اشاروں سے کام چلایا گیا ہو۔ ڈراما الفاظ سے نہیں عمل سے بنتا ہے۔ اسی لئے ارسطو کے بقول ''ڈراما عمل کی نقل ہے''۔

نورالحسن نقوی ڈراما کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ڈراما زندگی کی ایک ایسی نقل ہے جو اداکاری کے ذریعہ دیکھنے والوں کے سامنے اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ بالکل سچی اور اصل معلوم ہو''۔

یونانی فلاسفر ارسطو کا خیال ہے کہ:

''کسی عمل یا کسی حرکت نقل کرنے کا نام ڈراما ہے، لیکن اس نقل میں زندگی کی ترجمانی بھی ہے۔ دراصل ڈراما خود زندگی نہیں ہے بلکہ زندگی کو پیش کرنے کا محض ایک ذریعہ ہے''۔

ڈراما بھی ایک کہانی ہے لیکن ہر کہانی ڈراما نہیں ہوتی۔ اس کی خصوصیات داستان، ناول اور مختصر افسانے سے ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈرامے کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو خوب صورت اداکاری اور تاثرات کے ذریعہ ظاہر کرے۔ کہانی میں حرکت کی زیادتی اور کرداروں کا تصادم موجود ہونا چاہئے۔ ڈراما نگار انسانی زندگی کے عام کرداروں اور عام واقعات کو زیادہ جاندار اور نمایاں کر کے پیش کرتا ہے تاکہ وہ نگاہوں کا مرکز بن سکیں۔ ارسطو نے ڈرامے کو کسی عمل کی نقالی سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ نقالی دراصل زندگی کی عکاسی کا نام ہے۔ ڈراما خود زندگی نہیں بلکہ انسانی زندگی کو پیش کرنے کا ذریعہ ہے۔ ناول بھی تقریباً یہی کام انجام دیتا ہے مگر اس میں صرف انسانی زندگی کے کرداروں اور سیرتوں کی کہانی ہی ہوتی ہے جو بے جان سمجھی جاتی ہے اور ڈرامے میں کہانی کے ساتھ ساتھ انسانی عمل بھی ہمارے سامنے آتے ہیں اور یہی عمل ڈرامے کی جان ہے۔ گویا ڈرامے کی بنیاد ہی الفاظ، گفتار اور کردار کے عمل پر رکھی جاتی ہے جس میں انسانی زندگی کے حقائق اور مظاہر کو اشخاص اور مکالموں کے وسیلے سے عملاً پیش کیا جاتا ہے۔ ڈراما بھی داستان، ناول، مختصر افسانہ کی طرح ادبی حیثیت میں اپنا مقام حاصل کر چکا ہے۔

ڈراما نگار اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے لئے کردار اور مکالمے کا سہارا لیتا ہے اور سماج کے جس مسئلہ یا انسانی زندگی کی جس صداقت کو واضح کرنا چاہتا ہے اسے وہ کرداروں کی تعمیر اور اس کی برجستگی میں اس طرح سمو دیتا ہے کہ تماشائیوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا اور وہ اکثر غیر محسوس طور پر ڈراما نگار کے نقطۂ نظر سے متاثر ہوتے ہیں۔ ڈرامے کی فنّی کامیابی کے لئے ناقدین کے مختلف خیالات سامنے آئے ہیں۔ ارسطو نے ڈراما کے چھ اجزاء کو ضروری بتایا ہے۔ قصّہ، اشخاص، الفاظ، خیال، آراستگی اور موسیقی۔

ڈرامے میں مکالموں کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ انسانی زندگی کے کردار کا ماحول، اس کا شعور اور جذبات کے مطابق کردار کی زبان اور اس کی باتیں ہونی چاہئے تاکہ زندگی کے واقعات کی نقل اصل سے قریب تر ہو۔ مکالموں کے دوران شوخی اور ظرافت کی بھی جھلک ڈرامے میں پیدا کی جائے۔ ڈرامے میں ایک اور اہم بات انسانی کردار کی پیش کش ہے۔ اچھا ڈراما نگار ایسے انسانی اور سماجی کردار پیش کرتا ہے جو اپنی جگہ منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈراما نگار کا اصل کام انسانی زندگی کے کردار کی عکاسی ہے اور یہی ڈرامے کا فن ہے۔

اردو نثر کی کئی اصناف میں زندگی کے حالات و واقعات بے جان کرداروں سے پیش کئے جاتے ہیں۔ مگر ڈراما جاندار کرداروں سے عمل میں آتا ہے۔

ڈرامے کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ (۱) ٹریجڈی (حزنیہ یا المیہ) (۲) کامیڈی (طربیہ)

ہر صنف ادب کے کچھ مخصوص عناصر ترکیبی ہوتے ہیں۔ اسی طرح ڈرامے کے اجزائے ترکیبی یعنی فنّی لوازم یہ ہیں:

(۱) پلاٹ (۲) مرکزی خیال (۳) آغاز (۴) کردار و سیرت نگاری (۵) مکالمہ نگاری

(۶) تسلسل و کش مکش و تذبذب (۷) نقطۂ عروج (۸) اختتام (خاتمہ، انجام)

(v) مرثیہ کی تعریف کیجئے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالئے۔

جواب: ''مرثیہ'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کسی کی موت پر رونا۔ اصطلاح شاعری میں مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی تعریف اور اوصاف و فضائل بیان کئے گئے ہوں اور اس کی موت پر اظہار غم کیا گیا ہو۔ جیسے حالی، غالب، داغ اور سرسید وغیرہ پر مرثیے لکھے گئے لیکن عام طور پر اردو میں مرثیہ اس صنف نظم کو کہتے ہیں جو واقعات کربلا اور خاص طور سے امام حسین کی شہادت اور ان کے ساتھیوں کی شہادت پر کہے یا لکھے گئے ہوں۔ مرثیوں میں اشعار کی بھی کوئی حد نہیں ہے اور نہ کوئی شکل یا فارم متعین ہے۔ مرثیے میں جیتے جاگتے کردار ملتے ہیں اور واقعات کربلا میں حق و باطل کی جنگ، ظلم و مظلومیت کی داستان، گھوڑے اور تلواروں کی تعریف، پاکیزہ اخلاق، آل رسول اور ان کے ساتھیوں کا اعلیٰ کردار نظر آتا ہے۔

گویا مرثیہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) کربلائی مرثیہ (۲) شخصی مرثیہ

(۱) کربلائی مرثیہ: وہ مرثیہ جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے اقربا و رفقا کے اوصاف، ان کی شہادت کا بیان اور کربلا کے دیگر واقعات بیان کئے گئے ہوں، کربلائی مرثیہ کہلاتا ہے۔

(۲) شخصی مرثیہ: وہ مرثیہ جو مختلف افراد مثلاً کسی مشاہیر قوم یا کسی عزیز و اقارب کی موت پر لکھا گیا ہو، شخصی مرثیہ کہلاتا ہے۔ جیسے غالب کا ''مرثیۂ عارف''، حالی کا ''مرثیۂ غالب'' اور اقبال کا ''مرثیۂ داغ'' وغیرہ۔

مرثیہ کے ابتدائی دور میں صرف شخصی مرثیے لکھے گئے۔ سانحۂ کربلا سے متعلق مرثیے بعد میں لکھے گئے اور ہماری زبان میں ان کا اتنا عروج ہوا کہ مرثیے کا ذکر آئے تو ذہن شخصی مرثیے کی طرف نہیں بلکہ کربلائی مرثیے کی طرف ہی منتقل ہوتا ہے۔ شخصی مرثیے کے برخلاف اس کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس میں صرف اظہار غم اور مرنے والے کی تعریف اور توصیف ہی نہیں ہوتی بلکہ سانحۂ کربلا سے متعلق تمام واقعات ہوتے ہیں۔

اہمیت: مرثیہ ایک رزمیہ نظم ہے۔ اردو کی کسی دوسری صنف میں رزمیہ مضامین نہیں ملتے۔ مناظر کی عکاسی،

جذبات کی مرثیہ نگاری، نفسیاتی حالات کے نقشے جن ادبی خوبصورتی کے ساتھ مرثیوں میں پیش کئے گئے ہیں وہ یقیناً بے مثال ہیں۔ مرثیہ گوئی کی بدولت مذہبی، اخلاقی اور نیچرل نظموں کو بھی فروغ ہوا۔ مرثیے میں بھی وہ تمام چیزیں ملتی ہیں۔ غزل کا سوز و گداز، قصیدے کی شان و شوکت، مثنوی کا ربط و تسلسل، رزم و بزم کی عکاسی، فطرت نگاری، انسانی رشتوں کی عظمت و تعلقات کی ترجمانی، شجاعت، صبر و استقلال اور وفاداری مرثیے کا کمال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ اردو شاعری کی آبرو ہے اور سب سے قیمتی سرمایۂ ادب اور سب سے جاندار صنف ہے جس نے ہماری شاعری کے دامن کو وسعت دی اور ایک فرومایہ زبان میں ایسا قیمتی ذخیرہ فراہم کیا جو ترقی یافتہ زبانوں کے لئے بھی باعث فخر ہے۔

مرثیے کے لئے کسی خاص ہئیت یعنی فارم کی پابندی لازمی نہیں۔ غزل، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس، مربع کسی بھی فارم کو مرثیے کے لئے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مرثیے کو دراصل اس کے فارم سے نہیں بلکہ موضوع سے پہچانا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعری کی مختلف اصناف میں جو خصوصیات الگ الگ پائی جاتی ہیں، ان میں سے بیشتر مرثیے میں سما گئی ہیں۔ اس کی اہمیت پر سنبل نگار ان الفاظ میں تبصرہ کرتی ہیں:

''مرثیہ ہماری شاعری کی وہ صنف ہے کہ اس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ اس نے اردو شاعری کو نت نئے موضوعات عطا کئے اور وہ شاعری جس پر تنگ دامانی کی تہمت تھی، موضوعات کی بے پناہ وسعت سے دوچار ہوئی''۔

(vi) مثنوی کی تعریف کیجئے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالئے۔

جواب: مثنوی کے لغوی معنی ''دو دو کیا گیا'' یا ''دوہرا کیا ہوا'' کے ہیں۔ مثنوی اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس نظم میں ہر شعر کے قافیے اور ردیفیں دوسرے شعر کے قافیوں اور ردیفوں سے مختلف ہوں اور مضمون سلسلے وار ہو۔ مثنوی میں اشعار کی حد مقرر نہیں ہے۔ اس قسم کی نظم میں کوئی قصہ یا داستان بیان کی جاتی ہے۔ اس لئے اشعار کی تعداد سینکڑوں سے ہزاروں ہو سکتی ہے اور اس کو ہم نظمیہ داستان کہیں تو غلط نہیں ہے۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں مثنوی ایک اہم صنف سخن ہے اور اس نظم میں جن اور پریوں کی داستان، مافوق الفطرت عناصر کا ذکر، عام انسانوں کے خوشی و غم، حسن و عشق کے واقعات و جذباتی کیفیات کی عکاسی ملتی ہے۔ میدان جنگ کے ہنگامے، شادی اور موت کی رسمیں، قومی بود و باش، انسانی تہذیب و تمدن کا ذکر، اخلاقی، قومی، مذہبی تعلیم و تصوف کے مسائل کا بیان نظم کیا جاتا ہے۔

مثنوی کے ہر شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ مثنوی میں بھی قصیدہ کی طرح پانچ اجزائے ترکیبی ضروری ہیں۔

(۱) توحید و مناجات (۲) حاکم کی مدح (۳) تعریف شعر و سخن (۴) سبب تالیف (۵) اصلی قصّہ۔

مثنوی میں مضمون جو کچھ بھی ہو لیکن حقیقت پر مبنی ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح تسلسل کا ہونا اور ہر شعر کا اپنے پہلے شعر سے مربوط ہونا نہایت ضروری ہے۔ ان اوصاف کے علاوہ مواقع مناظر اور نفسی کیفیات کی توضیح و تشریح بھی ضروری ہے۔ اس سے شاعر اس ضمن میں خاص لطف اور نزاکت پیدا کر کے اپنی شاعری کا کمال پیش کرتا ہے۔ اس طرح مختلف اصناف شاعری کی جھلک مثنوی کے مختلف اجزاء میں نظر آتی ہے، جیسے کہیں ڈرامائی انداز ملتا ہے، کہیں مرقع نگاری ملتی ہے، کہیں طربیہ شاعری کی شگفتگی تو کہیں قصیدے کی شان و شوکت اور کہیں غزل کی دل گدازی۔ ان تمام عناصر کو مثنوی کے موضوع میں سمویا جاتا ہے جس سے اس میں دل کشی پیدا ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف مثنویوں میں اعلیٰ اور دل کش نمونے ملتے ہیں۔

مثنوی کی اقسام: مثنویاں موضوع کے اعتبار سے مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً عشقیہ قصّہ بیان کیا جائے تو مثنوی عشقیہ کہلاتی ہے۔ اگر جنگ کا بیان کیا جائے تو رزمیہ اور اگر تصوف کا بیان ہو تو صوفیانہ مثنوی کہلاتی ہے۔

علاّمہ شبلی نعمانی نے ایک کامیاب مثنوی کے لئے تین اوصاف کو جزو لاینفک تسلیم کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) حسن ترتیب: یعنی قصّے کو آغاز تا انجام ترتیب اور حسن کے ساتھ پیش کرنا تا کہ مثنوی زیادہ طویل نہ ہو اور گراں نہ گزرے۔

(۲) کردار نگاری: کردار نگاری اصلیت پر مبنی ہو نیز مثنوی کے تمام کردار جیتے، جاگتے اور متحرک ہوں۔

(۳) واقعہ نگاری: یعنی مثنوی میں جو قصّہ بیان کیا جا رہا ہے، وہ ایسا مکمل ہو کہ اس کی حقیقت قارئین اور سامعین کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

مولانا حالی کے نزدیک مثنوی اردو شاعری کی سب سے زیادہ کارآمد صنف سخن ہے۔ مگر ان کا خیال ہے کہ مثنوی کا یہ مقام صرف تبھی قائم رہ سکتا ہے، جب کہ مثنوی میں:

- ربط کلام ہو یعنی سلسلہ وار بات سے بات جڑی ہوئی ہو۔
- جھوٹ اور مبالغہ آرائی نہ ہو، بلکہ سچائی اور حقیقت بیان کی جائے۔
- قصّے کی تصویر کشی بہترین، فطری اور سادہ زبان میں کی گئی ہو۔

اہمیت: حقیقت یہ ہے کہ اگر مندرجہ بالا تمام خوبیاں شاعر کسی مثنوی میں پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو

پھر کوئی دوسری صنف سخن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بصورت دیگر مثنوی کا کوئی مقام و مرتبہ اردو شاعری میں نہیں ہے۔ خاص طور پر جھوٹ اور مبالغہ آرائی تو مثنوی کے لئے سم قاتل ہے۔ بحیثیت مجموعی اصناف شاعری میں مثنوی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں ظاہری اور معنوی ہر اعتبار سے بلند پایہ شاعری کے تمام لوازم موجود ہیں۔ مناظر قدرت، فلسفہ و تصوف کے طویل مباحث، حسن و عشق، رزم و بزم کی داستانیں اس صنف میں بخوبی نظم ہو سکتی ہیں اور واقعہ نگاری کے لئے اس نوع سے بہتر مشرق کی شاعری میں کوئی اسلوب نہیں۔

Group-B

۳. درج ذیل میں سے دو سوالوں کے جواب تفصیل کے ساتھ دیں: 2x20=40

(i) فن داستان گوئی سے اپنی واقفیت کا اظہار کریں۔

(ii) افسانہ کی تعریف کیجئے اور اس کی تکنیک پر روشنی ڈالئے۔

(iii) ادب کی تعریف کیجئے اور ادبی و غیر ادبی تحریروں میں کیا فرق ہے؟ واضح کیجئے۔

(iv) ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے''۔ کیا آپ اس خیال سے اتفاق و اختلاف کرتے ہیں؟ وضاحت کے ساتھ لکھئے۔

(v) قصیدہ کی تعریف کیجئے اور قصیدہ گوئی کے فن پر روشنی ڈالئے۔

(vi) ناول کی تعریف کیجئے اور اردو میں ناول کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالئے۔

جوابات: **(i) فن داستان گوئی**

زندگی جو کل تھی آج نہیں ہے جو آج ہے کل نہیں ہوگی کہ زینہ بہ زینہ اور منزل بہ منزل اس کا سفر ازل سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔ لیکن زندگی کے اس ارتقائی سفر میں یہ کہنا مشکل ہے کہ انسان کے شعور کی چاندنی نے رات کے اندھیرے میں اسے راہ دکھائی ہے یا اس کے خوابوں نے اسے حوصلہ بخشا ہے۔ مگر اس سچائی سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کل کے انسان نے جو خواب دیکھے تھے آج کا انسان انہیں حقیقتوں کا لباس پہنا رہا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہماری داستانیں ہمارے انہیں خوابوں کی امانتیں ہیں۔

وہ لوگ جنہیں داستانوں پر اعتراض ہے، کہتے ہیں کہ یہ داستانیں عام انسانی فضا اور واقعات سے تعلق نہیں رکھتیں۔ خصوصاً اردو داستانیں ایسی ہیں کہ فضا اور واقعات ایران و عرب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہماری یہ داستانیں ہماری عام زندگی سے میل نہیں کھاتیں کہ داستانوں کی دنیا خیالوں اور خوابوں کی دنیا ہوتی ہے۔ یہاں واقعات سحر و

طلسم کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔ ہماری ملاقاتیں مافوق الفطرت کرداروں سے ہوتی ہیں۔ بھوت، پریت، دیو، پری، جن دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کردار بھی جو بظاہر بشر ہوتے ہیں ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں جن کی توقع کسی بشر سے کی بھی نہیں جاسکتی۔ یہاں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ چراغ رگڑتے ہی جن برآمد ہوتے ہیں۔ قالین فضاؤں میں پرواز کرتی ہے۔ کھل جا سم سم کہتے ہی پوشیدہ خزانے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ راتوں رات ویرانوں کو شہر میں بدل دیا جاتا ہے۔ پلک جھپکتے ہی سات سمندر پار سے کوئی جن شہزادی کو داستان کے ہیرو کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ گویا یہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو عقل وشعور کی حدِ پرواز میں نہیں آتا۔

اس حقیقت سے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ داستانیں زوال پذیر معاشرے کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ معاشرے کے سہل پسند اور تن آسان لوگوں کی پیداوار ہیں اور ان کی طوالت سائنسی عہد کے معروف انسانوں کے لئے وبال جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج داستانوں کے پڑھنے والے بہت کم ملتے ہیں۔

یہ سب سچائیاں سہی لیکن ان سے بڑی سچائی یہ ہے کہ ادب کی صورتیں عصر کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اظہار کے سانچے بنتے اور بگڑتے ہیں اور اس تناظر میں داستانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوگی کہ ہماری داستانیں ہمارے ماضی کا شاندار ورثہ ہیں۔ ان کا مطالعہ زبان وبیان کی حسن کاری، واقعات کی بُنت کاری، تہذیب کی عکاسی میں ہماری مدد کرتا ہے۔ ایک زمانے میں ان داستانوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ غالب جیسا شاعر بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔

''داستان طرازی میں جملۂ فنون سخن ہے سچ ہے کہ دل بہلانے کے لئے اچھا فن ہے''۔

اور عصرِ حاضر کی تنقید کو وقار بخشنے والے نقاد کلیم الدین احمد کا قول ہے:

''داستان میں تو قصداً ایک ایسی دنیا کی تخلیق ہوتی ہے جو محض خیالی ہے جو لازمی طور پر ہماری جانی ہوئی چوبیس گھنٹوں والی دنیا سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے اگر دیکھی ہوئی جگہوں، معمولی چیزوں، جانے ہوئے لوگوں کا ذکر ہو تو پھر داستان کی مخصوص فضا پیدا نہیں ہوسکتی ہے۔ داستان کی دنیا داستان کی فضا میں 'دوری' کا وجود ضرور ہے''۔

یہ دوری دو اقسام کی ہوتی ہے، زمانی اور مکانی اور عموماً داستانوں میں دونوں قسموں کی دوریاں پائی جاتی ہیں کہ جس ملک، جس شہر کا ذکر ہوتا ہے وہ اکثر جغرافیائی دنیا میں نظر نہیں آتا اور اگر وہ جگہ یا شہر کہیں مل بھی جائے تو اتنا اجنبی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عصر حاضر ہی نہیں کبھی کبھی وہ زمانہ بھی نہیں ہوتا ہے جس زمانے میں داستان گو اور اس کے سامعین سانس لیتے تھے۔ اور اگلا زمانہ بھی متعین نہیں ہوتا اور اس دوری کی وجہ سے ایک نئی اجنبی ان دیکھی دنیا کی تخلیق میں آسانی ہوجاتی ہے۔ اس دنیا کے اپنے قوانین ہوتے ہیں، یہاں کی اپنی دلچسپیاں ہوتی ہیں، اپنی رنگینیاں ہوتی ہیں، اپنی اچھائیاں اور برائیاں ہوتی ہیں

جو ہماری دنیا سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ ان سے داستانوں میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور ''زمانی'' اور ''مکانی'' خامیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ یہ عجب پُر اسرار اور جادو کی دنیا ہوتی ہے اور یہی پُر اسراریت داستان کی روح ہے۔

داستان کہانی کی طویل، پیچیدہ، بھاری بھرکم صورت ہے۔ لیکن اس طوالت اور پیچیدگی کے باوجود کہانی سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ہوتی کہ یہ بھی دل بہلانے کی ایک صورت ہے کہ اس میں بھی حقیقت و واقعیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس میں بھی اعلیٰ ادبی فنّی اصول کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

داستان کو تازیانۂ عمل سمجھنا غلط ہے۔ گرچہ در پردہ عمل کی تحریک اس میں بھی ہوتی ہے مگر داستان کا بنیادی مقصد دلوں کو بہلانا ہے۔ یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہے کہ ہر زمانے میں پایا گیا ہے۔ داستان گوئی کا اہم گُر یہ ہے کہ بقول کلیم الدین احمد ''داستان گو اپنی شخصیت کو پس پردہ رکھے یا کم سے کم اس کی بے جا نمائش سے پرہیز کرے''۔ داستان کامیاب اس وقت ہو سکتی ہے جب سننے والا سنانے والے کے جادو میں گرفتار ہو جائے کہ اسے دنیا و مافیہا کی خبر بھی نہ رہے، وہ ہمہ تن گوش ہو جائے۔ لہٰذا اگر داستان گو اپنے علم و دانش کا مظاہرہ کرتا ہے تو یہ جادو ٹوٹ جاتا ہے۔

کلیم الدین احمد نے فن داستان گوئی کی تیسری خصوصیت داستان کو روکنا کہا ہے۔ یہ ایک فن بھی ہے اور تکنیک بھی، جس کی بدولت پیچ در پیچ قصّے پیدا ہوتے ہیں، بات سے بات نکلتی ہے، واقعات سے واقعات جنم لیتے ہیں۔ لیکن کلیم الدین احمد نے اس کی لازمی شرط یہ بھی بتائی ہے کہ ''اس میں نقطۂ عروج کا فنکارانہ ہونا لازمی ہے''۔ اور جب بھی واقعات میں اضطراب، تجسّس اور تحیّر پیدا ہوگا سننے والے کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوگی۔

کلیم الدین احمد کے علاوہ اردو داستانوں پر تفصیل سے کام وقار عظیم نے کیا ہے۔ ان کی کتاب ''ہماری داستانیں'' داستانوں کے مطالعہ کے لئے ایک اچھی کتاب ہے۔ اگرچہ موصوف کے خیالات میں کلیم الدین احمد کے تصورات کا عکس چمکتا ہے۔ وقار عظیم داستان کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''کہا جاتا ہے کہ داستان ایک دفتر بے معنی ہے۔ یہ ایک ایسے ماحول کی پیداوار ہے جو ہماری تاریخ، تمدن اور اخلاق کی روایات پر ایک بدنما داغ ہے۔ وہ ایسی زندگی کی ترجمان اور آئینہ دار ہے جو سرتاسر زندگی کی کشاکش اور اس کے فطری تقاضوں سے بے نیاز ہے اور اس زندگی کی مصوّر ہے جس کا سرے سے وجود ہی نہیں''۔

مشکل یہ ہے کہ یہی غیر فطری عناصر داستان کے فطری عناصر ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو داستان، داستان نہ رہے۔ اور یہ سب تخیل کی رفعت اور بلند پروازی، فکر و تصور کی ندرت اور جدت طرازی کا کرشمہ ہیں۔ اس رنگین اور انوکھی حیرت و استعجاب میں ڈوبی، رفیع اور پُر شکوہ دنیا کی تخلیق وہی ذہن کر سکتا ہے جس کا طائر تخیل بلند پرواز ہے اور جس کی آنکھیں دور بیں ہیں۔

یہ سچ ہے کہ داستان کی دنیا میں بسنے والے لوگ عجیب الخلقت ہوتے ہیں۔ان کا ہر عمل، ہر انداز غیر فطری ہوتا ہے۔حسن وعشق، جرأت ومردانگی، کرم وایثار، خیر وشر غرض کہ یہ اپنی ہر ادا میں ہماری دنیا کے انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں کی ہر ابتدا میں انتہا کی جھلک ملتی ہے۔ ہر بات مثالی ہوتی ہے۔لیکن یہاں بھی فن کا ایک تقاضہ ہوتا ہے، ایک مطالبہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان عجیب وغریب اشیاء میں ایک تناسب ہوتا ہے۔میر کے شعروں کی طرح ''بہ غایت پست بسیار بلند'' والی بات نہیں ہوتی۔ داستان میں تناسب کا ہونا لازمی ہے۔ یہاں دیو ہیں تو ضروری ہے کہ انسان بھی ایسے ہوں جو ان کے مدّ مقابل بن سکیں۔ پریوں کا حسن نظر فریب ہے تو ہیروئن کا جمال بھی جنوں خیز ہے۔داستان کے فن کا ایک بڑا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں لطفِ داستان ہو۔، افسانوی کش مکش اور دل نشینی بھی موجود ہو۔ یہ سب اگر نہیں ہے تو داستان کو کوئی چھونا بھی گوارہ نہیں کرے گا۔ چنانچہ ممتاز حسین لکھتے ہیں۔

> ''داستان سے لطف اندوز ہونے کی ہماری صلاحیت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے برعکس کچھ زیادہ بڑھی ہے۔ کیونکہ اب ہم داستانوں کی جذباتی اور داخلی گرفت سے آزاد ہو گئے ہیں۔آج ان کا تجزیہ ہم خارجی انداز سے کرنے پر قادر ہیں''۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی جب کہ جنگل کٹ رہے ہیں اور شہر کی سرحدیں بڑھتی جارہی ہیں، آج کے صنعتی عہد کا انسان تعقل کی زمین پر چلتا ہے اور وقت اور فاصلے اس کے قدموں کے نیچے سمٹ آئے ہیں۔ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے فکشن کا سہارا لیتا ہے اور فکشن کا آرٹ تجرید وعلامت کا سفر طے کرتا ہوا دوبارہ داستانوں کے قریب آنے لگا ہے۔

(ii) افسانہ کی تعریف اور اس کی تکنیک (فن)

اردو زبان میں مختصر افسانہ مغربی ادب کی دین ہے اور مغرب کی زبانوں میں ایک جدید ادب کی حیثیت سے انیسویں صدی کے آخر کی پیداوار ہے۔ اردو میں اس صدی کے شروع میں سب سے پہلے پریم چند نے افسانے لکھنے شروع کئے۔ دراصل یہ صنف ملک کے بدلتے ہوئے حالات، نئی خیالات اور ادب کے نئے تقاضوں کی وجہ سے وجود میں آئی۔

انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں مختصر افسانے سے پہلے ناول، تمثیلی قصّے اور طویل افسانے لکھے گئے اور جب وہاں زندگی کی کشمکش بڑھی، انسان کے لئے فرصت اور فراغت کم ہوئی تو ایک ایسی صنفِ ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جو کم سے کم وقت میں پڑھنے والوں کو مسرت اور تسکین دے سکے۔اس وقت تک رسالے اور اخبار بھی کثیر تعداد میں چھپنے لگے تھے۔ اس لئے ان کے لئے بھی ایسی دلچسپ کہانیوں کی ضرورت تھی جنہیں عام لوگ پڑھنا پسند کریں اور مختصر اور مکمل ہوں تا کہ ایک ہی نشست میں انہیں پڑھا جا سکے۔اس طرح مختصر افسانہ نگاری کا رواج ہوا۔

مختصر افسانے کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مختصر افسانہ ایک ایسا نثری قصّہ ہے جس کے پڑھنے میں آدھ گھنٹے تک کا وقت لگے یا یہ کہ مختصر افسانہ کسی شخص کی زندگی کے سب سے اہم اور دلچسپ موقع کو ڈرامائی شکل میں پیش کرنے کا نام ہے۔ ایک عالم نے یہ بھی کہا ہے کہ مختصر افسانہ کسی ایسے واقعہ کا بیان ہے جو سنا نہ گیا ہو لیکن جو کسی کو پیش آیا یا آ سکتا ہو۔ ایک دوسرے ناقد کا کہنا ہے کہ مختصر افسانہ کسی ایک واقعہ کا بیان ہے جس میں ابتدا ہو، درمیان ہو، عروج ہو، خاتمہ ہو۔

ان میں سے کوئی بھی تعریف مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ ہر ایک میں کوئی کمی ضرور ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان میں سے ہر تعریف میں مختصر افسانہ کے کسی خاص پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ کہیں اس کے اختصار پر زور ہے تو کہیں اس کے دلچسپ پلاٹ پر، کہیں اس پر کہ افسانہ میں ایک ہی واقعہ بیان ہونا چاہئے۔ دراصل اس صنف کی کوئی دوٹوک اور مکمل تعریف مکمل بھی نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس صنف میں بڑا لوچ ہے اور بدلتی ہوئی زندگی اور زمانے کے ساتھ ساتھ افسانے کی تکنیک میں بھی رنگا رنگی پیدا ہوتی رہی۔ ناول کی طرح مختصر افسانہ بھی ایک حقیقت پسندانہ صنف ہے۔ انسانی زندگی اور اسے بہتر بنانے کے لئے سماج اور فطرت کی طاقتوں سے کش مکش اس کا موضوع ہے۔ ناول کی طرح اس میں بھی سماجی مسائل اور افراد کی ذہنی اور جذباتی الجھنوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ لیکن دونوں اصناف میں زندگی کی ترجمانی کا جو فرق ہے، اسی سے ان کے فن کی خصوصیت کا تعین ہوتا ہے۔

افسانہ میں زندگی کے کسی ایک گوشے، کسی ایک واقعہ یا کسی ایک نفسیاتی حقیقت کو موثر طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ ناول میں پھیلاؤ کی وجہ سے تفصیلات کی زیادہ گنجائش ہے۔ افسانہ میں ہر بات اختصار اور اشاروں میں کہی جاتی ہے۔ ناول میں کرداروں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ افسانہ میں کرداروں کی تعداد کم سے کم ہوتی ہے۔ ناول میں قاری کی توجہ ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف ہٹتی اور بڑھتی ہے۔ مختصر افسانہ میں اکثر کوئی ایک واقعہ ہی قاری کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ پریم چند نے لکھا ہے کہ میرے افسانوں کی بنیاد کوئی نہ کوئی نفسیاتی واقعہ ہوتا ہے اور جب تک کوئی ایسی بنیاد نہیں ملتی میں افسانہ لکھنا شروع نہیں کرتا۔ لیکن افسانہ میں نفسیاتی حقیقت کے موثر اظہار کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ کے فنی لوازمات کو مہارت اور تخلیقی حسن کے ساتھ برتا جائے۔ کہانی کہنے کا انداز موضوع کے مطابق ہو۔ افسانہ نگار ابتدا ہی سے ایسی فضا پیدا کر دے کہ جس میں پہنچ کر قاری کو کسی طرح کی اجنبیت نہ محسوس ہو۔ جیسے جیسے وہ پڑھے اس کی دلچسپی اور جستجو بڑھتی جائے اور پھر افسانہ اپنے فطری منتہا پر پہنچ کر ایک موثر طریقہ پر ختم ہو جائے۔

افسانہ میں کہانی کہنے کا اسلوب یا انداز ہی اس کی تکنیک کہلاتا ہے۔ افسانہ نگار آزاد ہے کہ وہ جس انداز میں چاہے واقعہ بیان کرے۔ وہ ایک راوی یا تماشائی کی حیثیت سے بھی کہانی لکھ سکتا ہے۔ خود افسانہ کا ایک کردار بھی بن سکتا ہے یا اگر چاہے تو کسی کردار کی زبانی کہانی کو بیان کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ ڈائری، خطوط یا سفر نامہ کی صورت میں بھی افسانہ کو ترتیب

دے سکتا ہے۔بس اس کا خیال رہے کہ افسانہ میں دلچسپی قائم رہے اور اس کے مختلف اجزا میں ہم آہنگی اور تناسب ہو۔

فن افسانہ کے اجزائے ترکیبی: پلاٹ، کردار، نقطۂ نظر، ماحول اور فضا، اسلوب، آغاز و اختتام۔

پلاٹ: افسانہ کا پلاٹ سادہ، سلیس اور مختصر ہونا چاہئے۔اس میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ ہو۔افسانے میں پیش کئے جانے والے تمام واقعات، مرکزی خیال کے اردگرد اور ترتیب سے ہونے چاہئیں۔افسانے میں ضرورت سے زیادہ باتوں سے گریز کیا جائے۔واقعات کا تسلسل ہی پلاٹ کو مضبوط اور مستحکم بناتا ہے۔وہ افسانے جن میں پلاٹ نہیں ہوتا ان کا تاثر بے اثر ہوتا ہے۔قاری کو اپیل نہیں کرتا۔افسانے کی دلچسپی برقرار نہیں رہتی۔

کردار: افسانے کا کامیاب پلاٹ وہ ہے جس میں کردار نگاری حسب پلاٹ کی جائے۔دراصل واقعات کے تسلسل میں کرداروں کی ترجمانی ہوتی ہے۔اس لئے ناول کی طرح افسانہ نگاری میں بھی کرداروں کی بڑی اہمیت ہے۔لیکن ناول میں کردار نگاری مختلف انداز کی ہوتی ہے۔افسانے میں اتنی گنجائش نہیں کہ باقاعدہ کردار نگاری کے ہر پہلو کو افسانے میں پیش کیا جائے۔اس کے بجائے کرداروں کے پہلوؤں کی طرف اشارے دئے جاتے ہیں۔کردار نگاری افسانے میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

کردار دو طرح کے ہوتے ہیں: اوّل سپاٹ یا جامد، دوم پیچیدہ۔ان میں جامد کردار اپنی فطرت کو نہیں بدلتے۔ایک ہی رُخ پر اڑے رہتے ہیں۔لیکن پیچیدہ کردار مختلف پہلوؤں سے گزر کر اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔افسانے میں ایسے تمام کرداروں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔اس طرح کرداروں کی جھلکیوں اور کرداروں کے نظریہ کے ساتھ افسانہ کا فن مضبوط ہوتا ہے۔

کرداروں کی ادائیگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پلاٹ سے مناسبت رکھتے ہوں اس سے الگ نہیں ہوں۔ان میں گہرا ربط ہونا چاہئے۔انسانی نفسیات سے کردار کا گہرا تعلق ہونا چاہئے۔

نقطۂ نظر: افسانہ میں مصنف کا ایک نقطۂ نظر ہونا ضروری ہے۔کوئی بھی واقعہ یا افسانہ خاص مقصد اور نظریہ کا حامل ہوتا ہے جو سماج کے کسی نہ کسی مسئلہ کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے۔لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ تخلیق کار کے نظریہ کو قاری جوں کا توں تسلیم کرلے۔قاری کا نظریہ اس کے شعور کے مطابق بدل سکتا ہے۔

بہرحال افسانہ نگار اپنا نقطۂ نظر افسانے میں پوشیدہ رکھتا ہے اور افسانے کا تانا بانا اس طرح بنتا ہے کہ قاری اس کے نقطۂ نظر تک پہنچ جاتا ہے۔قاری کی فکر اور دلچسپی افسانہ سے بڑھتی جاتی ہے۔نقطۂ نظر کی ترجمانی کے لئے تخلیق کار میں نفسیاتی گہرائی کو سمجھنے کا شعور ہونا چاہئے۔

ماحول اور فضا: افسانے میں پلاٹ اور کردار کے حسب حال ایسی فضا ہموار کی جائے جس میں قاری محو ہو

جائے۔اسے کہانی کا ہر منظر سامنے نظر آئے۔وہ مخصوص ماحول کو محسوس کرے۔بدلتے ہوئے ماحول اور فضا کی پیش کش افسانے میں اس طرح کی جائے کہ انسانی جذبات،خوشی وغم کے احساسات اور حرکات متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور ایک مخصوص فضا اور ماحول میں افسانہ مکمل ہو جائے۔

تکنیک: افسانے کی تکنیک یعنی اس کا اسلوب بہت سادہ عام فہم ہونا چاہئے۔الفاظ کی بھرمار اور طوالت نہیں ہونی چاہئے۔بلکہ کم سے کم الفاظ میں مفہوم تک پہنچایا جائے۔غیر ضروری باتوں سے پرہیز کیا جائے۔افسانے کی زبان دلچسپ اور آسان ہو،تفصیلی اور وضاحتی زبان و بیان کے بجائے پلاٹ اور کردار کے مطابق ہونا چاہئے۔

آغاز واختتام: افسانے کی کامیابی کا دارومدار اس میں ہے کہ اس کا آغاز پُرکشش ہو جس کی طرف قاری میں توجہ اور دلچسپی پیدا ہو۔اس کے افسانہ پڑھنے کی خواہش میں اضافہ ہو سکے۔آغاز سے اختتام تک کا تخلیقی سفر قاری میں تجسس پیدا کردے۔اس کی دلچسپی اور لگن کو بڑھادے۔ایسا نہ ہو کہ درمیان میں ہی افسانہ ادھورا چھوڑ دے۔اس کے لئے افسانے کے آغاز کا سفر مکمل ہو اور اختتام ایسا ہو جو اس میں تجسس پیدا کردے،اس پر گہرا تاثر قائم کردے۔